فیض احمد فیض کے ایام اسیری اور شاعری

The Days of Imprisonment and Poetic Contribution of Faiz Ahmad Faiz: A Critical Study

ڈاکٹر خالد محمود *

سید نوشاد حسین**

Abstract

Faiz Ahmad Faiz was the intellectual poet of pro-left ideology in Pakistan. He struggled to highlight the issues of poor and labor class in the country. He worked in newspapers and through his writings he worked for communism and anti capitalism. Due to Rawalpindi Conspiracy Case, he was arrested along with army officers who were his friends. Faiz and army officers were blamed that they wanted to take over the government. He was put into prison in March 1951 under Rawalpindi Conspiracy Case. When he was released after four years, he continued his writings as his mission. During martial law era of Ayub Khan, Faiz was arrested once again and imprisoned. The prison experience for Faiz had a meaningful and valid position. He even wrote poetry in jail which shows the pain and discomfort, patriotism, humanism and his voice against oppression. Faiz also had to spend some time in exile. He died for more than 35 years ago; however, his poetry reflects the real issues of Pakistan even today.

---

* لیکچرر، شعبہء مطالعہ پاکستان، علامہ اقبال اوپن یونیورسٹی، اسلام آباد۔

** ایم فل اسکالر، شعبہء مطالعہ پاکستان، علامہ اقبال اوپن یونیورسٹی، اسلام آباد۔

تلخیص

فیض احمد فیض پاکستان میں کمیونسٹ نظریات کا حامی وہ دانشور شاعر تھا جس نے پاکستان میں غریب اور مزدور طبقے کے مسائل اجاگر کرنے کی جدو جہد کی۔ جب کہ حکومتوں کی جانب سے فیض کے لیے زندگی کا دائرہ تنگ کیا جاتا رہا۔ راولپنڈی سازش کیس کا مقدمہ بنا کرانہیں مارچ ۱۹۵۱ء میں جیل بھیج دیا گیا۔ چار برس بعد رہائی ملی تو ہر خاص و عام میں مقبول ہو چکے تھے۔ ایوب خان کے مارشل لاء دور میں انہیں دوبارہ گرفتار کر کے پابند سلاسل کر دیا گیا،فیض کے لیے جیل کا تجربہ معنوی حیثیت رکھتا تھا۔ انہوں نے جیل میں رہ کر جو شاعری کی اس میں فیض کا درد، کرب، حب الوطنی، انسان دوستی اور ظلم کے خلاف جدو جہد واضح نظر آتی ہے۔فیض نے کچھ عرصہ جلاوطنی میں بھی بسر کیا۔فیض کودنیا چھوڑے ۳۵ برس سے زیادہ عرصہ گزر گیا مگر آج بھی ان کی شاعری میں پاکستان کے مسائل کی نمایاں جھک محسوس کی جا سکتی ہے۔

فیض احمد فیض کے ایام اسیری اور شاعری

فیض احمد فیض متحدہ ہندوستان کے شہر سیالکوٹ میں ۱۹۱۱ء میں پیدا ہوئے۔ انٹرمیڈیٹ کے بعدلاہور آ کرگورنمنٹ کالج سے انگریزی اور عربی میں ایم اے کیا جو اس دور میں غیر معمولی بات تھی۔ فیض اپنی زندگی میں متعدد پیشوں سے منسلک رہے۔ کالجوں میں انگریزی ادب کے لیکچرار بھی رہے تو ترقی پسند تحریک کی بنیاد رکھنے والوں کے ساتھ بھی کارہائے نمایاں انجام دیے۔ پانچ سال تک فوج میں کپتان، میجر اور لیفٹیننٹ کرنل کے عہدوں پر کام کیااور ۱۹۴۷ء میں مستعفی ہوئے۔ پاکستان کے قیام کے فوراً بعد کمیونسٹ پارٹی کی بنیاد رکھی۔ بعد ازاں 'امروز' اور 'پاکستان ٹائمز' کے ایڈیٹر رہے۔ کراچی میں عبداللہ ہارون کالج کے پرنسپل اور نیشنل کونسل آف آرٹس کی صدارت کے بھی فرائض انجام دیے۔ ان تمام خدمات کے باوجود دنیا بھر میں آپ کی وجہ شہرت آپکی شاعری بنی اور پاکستانی قوم کی بڑی تعداد آج بھی فیض صاحب کو صرف شاعر ہی سمجھتی ہے۔

سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ فیض احمد فیض انتہائی نامور اور ہر دل عزیز شاعر کیسے بنے؟ کیا ان کی یہ صلاحیتیں ودیعت تھیں یا ایام اسیری اور جلاوطنی نے انہیں بام عروج پہ پہنچایا؟ اصُولاً یہ بات نہیں کہی جا سکتی کہ قومی یا بین الاقوامی شہرت حاصل کرنے کے لیے جیل جانا بھی ضروری ہے

تاہم متعدد نامی گرامی شخصیات کی عوامی شہرت کا سلسلہ سلاخوں کے پیچھے رہنے کے بعد ہی شروع ہوا۔ سیاسی شخصیات کے حوالے سے یہ بات قدرے زیادہ وثوق سے کہی جا سکتی ہے۔ انگریز حکومت کے خلاف آزادی کی جدوجہد جاری رکھنے ہی کے نتیجے میں مہاتما گاندھی، نہرو، مولانا آزاد اور کئی رہنماؤں کی مقبولیت میں خاطر خواہ اضافہ ہوا۔ جب کہ محمد علی جناح یا علامہ اقبال نے ایک بار بھی جیل کا منہ نہ دیکھا اس کے برعکس وہ دونوں بین الاقوامی سیاست میں ایک قابل قدر مقام پر پہنچ گئے۔ بہر کیف، اس منطق کے حق اور مخالفت دونوں میں کئی مثالیں پیش کی جا سکتی ہیں۔ اس حوالے سے کوئی ثانوی رائے نہیں کہ زندگی کا وہ حصہ جو فیض نے جیل میں بسر کیا اس نے ان کی شاعری پہ گہرے اثرات مرتب کیے اور یہ بھی کہ ایام اسیری کی شاعری ان کے تخلیقی سفر کا ایک اہم اور منفرد پہلو ہے۔

فیض صاحب جب کالج میں زیر تعلیم تھے تب سے شاعری کر رہے تھے، اسی زمانے میں انہوں نے اشتراکی نظریات اپنائے تھے۔ کالج ہی کے زمانے میں انہوں نے علامہ اقبال کے سامنے اپنا کلام سنایا تھا اور اقبال نے انہیں داد بھی دی۔ پھر برسوں بعد اقبال کی شاعری کے بارے میں فیض نے اس طرح اظہار کیا تھا ۔

'جہاں تک شاعری میں حسیت زبان اور اس کی موسیقیت کا تعلق ہے ہم تو ان کے مقابلے میں اُن کی خاک پا بھی نہیں ہیں۔ علامہ بہت بڑے شاعر ہیں۔ اگر وہ اشتراکیت کے معاملے میں ذرا سنجیدہ ہو جاتے تو ہمارا کہیں ٹھکانا نہ ہوتا'۔ فیض اپنی تعلیم پوری کر کے امرتسر کے ایک کالج میں مدرس ہوگئے تھے۔ پھر کچھ عرصہ بعد وہ لاہور چلے آئے اور یہاں بھی معلّمی کے فرائض نبھائے۔ ایک دن اپنے ایک دوست میجر مجید ملک کے کہنے پر فوج میں حصول ملازمت کی خاطر کرنل بیرڈ کے سامنے انٹرویو دینے پہنچ گئے۔ اس موقعہ پر کرنل صاحب کا روّیہ خاصا دوستانہ تھا۔ اس نے فیض کے سامنے ایک سرکاری راز کا انکشاف کرتے ہوئے بتایا کہ فائل میں درج ہے کہ تم کمیونسٹ ہو۔ جب فیض نے اپنی صفائی اس طرح پیش کی ' میں کمیونسٹ پارٹی کا ممبر ہرگز نہیں ہوں' یہ سُن کر کرنل نے انہیں تنبیہہ کرنا ضروری سمجھا۔ 'ذرا خیال رکھنا ' اور انہیں ملازمت میں لے لیا۔ اس بات سے ثابت ہوتا ہے فیض کے خیالات کالج کے زمانے ہی سے اشتراکی بن چکے تھے۔

۱۹۴۱ء میں ان کا مجموعہ کلام 'نقش فریادی' لاہور سے چھپا اس مجموعہ سے متعلق باقر مہدی کا کہنا ہے کہ نقش فریادی ایک ایسے شاعر کی غزلوں اور نظموں کا مجموعہ ہے جو رومان اور حقیقت کے سنگ پر کھڑا ہے۔ فیض کی مقبولِ عام غزل 'مجھ سے پہلی سی محبت میرے محبوب نہ مانگ' بھی اس مجموعے میں شامل ہے جسے ملکہ ترنم نور جہاں سمیت برصغیر کے کئی گلوکاروں نے گایا۔ یہ نظم ایک جذباتی نو جوان ودانشور شاعر کی اندرونی کش مکش کو بڑی خوبصورتی سے پیش کرتی ہے۔

میں نے سمجھا تھا کہ تو ہے تو درخشاں ہے حیات
تیرا غم ہے تو غمِ دہر کا جھگڑا کیا ہے
تیری صورت سے ہے عالم میں بہاروں کو ثبات
تیری آنکھوں کے سوا دنیا میں رکھا کیا ہے؟
اور بھی دُکھ ہیں زمانے میں محبت کے سوا
راحتیں اور بھی ہیں وصل کی راحت کے سوا
مجھ سے پہلی سی محبت میرے محبوب نہ مانگ

فیض کے بارے میں ایک وا قعہ منقول ہے کہ جامعہ ملیہ اسلامیہ کی سلور جوبلی تقریبات کے موقعہ پر ڈاکٹر ذاکر حسین صاحب نے ایک مشاعرہ کا اہتمام کیا۔ یہ بات دلچسپی سے خالی نہیں کہ مشاعرہ کے اسٹیج پر انہوں نے گاندھی او جناح دونوں رہنماؤں کو یکجا کر دیا۔ مزید یہ کہ وہاں جوش، جگر، فراق جیسے شعراء کے ساتھ فیض بھی مدعو تھے۔ یہ وہی مشاعرہ ہے جس میں فیض نے گاندھی جی کے بارے میں اپنی نظم 'سیاسی لیڈر' سنائی تھی تاہم اس نظم پر انہیں خاطر خواہ داد نہ مل سکی اس کی وجہ شاید یہ تھی کہ تب انہیں جوش، جگر اور فراق کے مقابلے کا شاعر تسلیم نہیں کیا جاتا تھا۔

۱۹۴۷ء میں آزادی کے بعد وہ دہلی چھوڑ کر پاکستان میں مقیم ہوئے، قیام پاکستان کے بعد نہ صرف برصغیر میں بلکہ ساری دنیا میں اہم اور بنیادی سیاسی تبدیلیاں رو نما ہورہی تھیں۔ ان تبدیلیوں نے فیض کے دل و دماغ دونوں کو جھنجوڑ کر رکھ دیا۔ فیض صاحب پاکستان ٹائمز کی ادارت سے وابستہ ہونے کی وجہ سے بصیرت سے بھی سرفراز ہو گئے تھے اور دور دراز رونما ہونے والی

تبدیلیوں سے بہتر طور پر آشنا ہو چکے تھے۔ پاکستان کے قیام سے قبل ہر طبقے کے لوگوں کا تناظر پاکستان کے لیے مختلف تھا۔ کچھ لوگ اپنے معاشی مسائل کا حل چاہتے تھے، کچھ اسلامی نظام کا نفاذ چاہتے تھے اور کچھ سرمایہ دارانہ نظام کے خلاف بر سر پیکار تھے۔ پاکستان قائم ہونے کے بعد متعدد رہنماجن کا تعلق بائیں بازو سے تھا وہ بھی حکومت میں شامل تھے۔ اسی زمانے میں پڑھے لکھے لوگوں کی اپنی تنظیمیں بھی بن چکی تھیں۔ فیض کو اردو، انگریزی، پنجابی، فارسی سمیت کئی زبانوں پر عبور تھا یہی وجہ تھی کہ فیض نے ان لوگوں کے جذبات کو اپنی شاعری کی زبان دی۔ فیض صاحب نے عام انسان خاص طور پر مزدور طبقے کے مسائل کو قریب سے دیکھا اور سمجھا۔ دوسری جنگ عظیم کے بعد افریقہ اور ایشیائی ممالک میں پیدا ہونے والی ہلچل بھی ان کے روبرو تھی۔ حکومتی پابندیوں کے باوجود فیض نے پاکستان کی حکمران جماعت کے عمل اور لائحہ عمل دونوں کو اپنی تنقید کا نشانہ بنایا۔ اس دور میں نہ صرف ایشیا بلکہ افریقہ کے متعدد ممالک میں بھی آزادی کی خاطر باغی تحریکات سامنے آ رہی تھیں۔ بلاشبہ یہ کہا جا سکتا ہے کہ ان آزادی کی تحریکوں میں فیض احمد فیض ذہنی طور پر شامل رہے تھے۔ دوسرے الفاظ میں کہا جا سکتا ہے کہ یہ دور فیض کے لیے سیاسی سوچ کے اعتبار سے تربیت کا زمانہ تھا۔ فیض نے جب محسوس کیا کہ پاکستان کی سرزمین اہل وطن کے لیے تنگ کی جا رہی ہے تو اسکے جذبات نے ان الفاظ کا روپ دھار لیا۔

یہ داغ داغ اُجالا، یہ شب گزیدہ سحر
وہ انتظار تھا جس کا یہ وہ سحر تو نہیں

فیض کا مندرجہ بالا شعر اس بات کی وضاحت کر رہا تھا کہ یہ وہ پاکستان نہیں تھا جس کا خواب برصغیر کے مسلمانوں نے دیکھا، نہ ہی فیض کو یہ قائداعظم کا پاکستان نظر آ رہا تھا۔ فیض کے خیال میں یہ ملک غریبوں ،مزدوروں اور جفاکش لوگوں کا بھی نہیں تھا۔ اسی آواز کو اٹھانا فیض کا جرم بن گیا۔ فیض نے جب پاکستان کے عوام کو حقوق دلانے کی بات کی تو حکومت نے اسے بغاوت اور غداری قرار دیا۔ راولپنڈی سازش کیس میں فیض کی گرفتاری کا سانحہ کوئی معمولی سانحہ نہیں تھا۔ اس زمانہ کے اخبارات اور دستاویزات سے اندازہ ہوتا ہے کہ فیض کو اس سازش کا سرکردہ ہی نہیں اس کیس میں گرفتار ہونے والوں میں انتہائی خطرناک باغی ظاہر کیا جا رہا تھا۔ ۹ مارچ ۱۹۵۱ء

کی صبح جب وہ گرفتار ہوئے تو اسی دن پاکستان کے وزیر اعظم لیاقت علی خاں نے پارلیمنٹ میں یہ بیان دے کر ساری دنیا میں سنسنی پھیلا دی کہ سازشی افراد کمیونسٹ اور انقلابی ذرائع کی کمک سے بذریعہ تشدد حکومت کا تختہ الٹنا چاہتے تھے۔ اسی سازش سے انکار کرتے ہوئے فیض نے بہت خوب صورتی سے وضاحت کی۔

وہ بات سارے فسانے میں جس کا ذکر نہ تھا
وہ بات ان کو بہت ناگوار گزری ہے

فیض کے بقول' قصہ صرف اتنا تھا کہ ہم لوگوں نے ایک دن بیٹھ کر بات کی کہ اس ملک میں کیا ہونا چاہیے ؟ کس طریقے سے یہاں کے حالات بہتر بنائے جائیں، چونکہ ملک کو بنے ہوئے چار پانچ سال کا عرصہ گزر چکا تھا اور نہ یہاں آئین بنا تھا، نہ سیاست کا ڈھانچہ ٹھیک طریقے سے منظّم ہوا تھا'۔

حکومت کے مطابق اس مقصد کے حصول کے لیے پاکستان میں کمیونسٹ نظریات کے حامل رہنما مسلح افواج کے ان عہدہ داروں سے کام لینا چاہتے تھے جن سے ان کا رابطہ استوار تھا یعنی کہ اصل مجرم فوجی افسران نہیں تھے بلکہ کمیونسٹ اور ان کے رہنما فیض تھے۔ فیض کے مکان کی تلاشی کا ذکر کرتے ہوئے لاہور کے روزنامہ' سول اینڈ ملٹری گزٹ' نے لکھا تھا کہ قانون نافذ کرنے والے اداروں کے اہلکاروں کی جانب سے فیض کے گھر کی تلاشی چھ گھنٹے تک لی جاتی رہی اور اس تلاشی کے دوران پولیس نے اہم خطو ط اور دستاویزات برآمد کرکے سازش کو بے نقاب کر دیا۔صرف یہی نہیں بلکہپاکستانی اخبارات نے فیض صاحب پر غداری کا فتوی لگا دیا ادبی رسالوں نے اپنی دکانداری کو چمکانے کے لیے غدار نمبر شائع کیے۔

فیض نے سچ ہی تو کہا تھا کہ
چھوڑا نہیں غیروں نے کوئی ناوک ِدشنام
چھوٹی نہیں اپنوں سے کوئی طرز ملامت

اپنے وطن میں رہ کرقیدو بند کی صعوبتیں برداشت کرنا یہ فیض کی حب الوطنی کو ثابت کرنے کے لیے کافی ہے۔ فیض کے لیے کرب تنہائی کا یہ تجربہ اتنا شدید تھا کہ فیض کے سارا وجود ہی درد و الم

سے بھر چکا تھااور یہی وہ درد تھا جس نے فیض کی شاعری کو کربناک انداز دے دیا۔ ساحر لدھیانوی نے بھی تو کہا تھا کہ

دنیا نے تجربات و حوادث کی شکل میں
جو کچھ مجھے دیا ہے وہ لوٹا رہا ہوں میں

فیض کی زندگی کس کرب میں گزری اس بات کا انداز ہ درج ذیل اشعار سے لگایا جا سکتا ہے۔

یہ دل کے داغ تو دکھتے یوں بھی پر کم کم
کچھ اب کے اور ہے ہجرانِ یار کا موسم
یہی جنوں کا یہی طوق و دا ر کا موسم
یہی ہے جبر یہی اختیار کا موسم
قفس ہے بس میں تمہارے، تمہارے بس میں نہیں
چمن میں آتش گل کے نکھار کا موسم

راولپنڈی سازش کیس میں جب فیض صاحب کو پابند سلاسل کیا گیا توان کے خیالات کی گہری چھاپ ان کی شاعری میں نظر آنے لگی۔ ان کی حب الوطنی کا جذبہ ماند پڑنے کی بجائے دن بدن عروج کی جانب سفر کرتا رہا اور ساتھ ہی احتجاج اور مزاحمت کا رنگ انکے اشعار میں بیدار ہوا۔ یہی درد اب فیض کی بے پناہ مقبولیت کا سبب بن گیا تھا، ان کے ساتھ سجاد ظہیر بھی جیل میں مقید تھے۔ سجاد قید میں رہتے ہوئے اپنی رفیقہ ء حیات کو جب خط لکھتے تھے تو فیض کا تذکرہ بھی کرتے تھے ان خطوط سے معلوم ہوتاہے کہ فیض جب شعر کہتے تھے تو ان کے ساتھی جشن منایا کرتے تھے۔ حقیقت تو یہ ہے کہ حکومت فیض کو قید کر سکتی تھی اس کی شاعری کو نہیں۔ یہی وجہ ہے کہ فیض کا کلام جیل سے باہر مسلسل آتا رہا۔ انہوں نے مذکورہ کیس میں تقریباً چار برس جیل میں گزارے اس دوران انہیں مختلف جیلوں میں منتقل کیاجا تا رہا۔ کراچی سے لے کر سرگودھا، منٹگمری اور لاہور کی جیلوں میں قید رہے۔ جب وہ لاہورکی جیل میں بند تھے توان کے دانتوں میں تکلیف کے سبب انہیں بند گاڑی میں سوار کر کے دندان ساز کے پاس اکثر لے جایا جاتا۔ اتفاقی طور پر

ایک دن گاڑی موجود نہ تھی اور فیض کو تانگے میں لے جانا پڑا جبکہ فیض کے دونوں جانب مسلح سپاہی مامور تھے۔ اس قصہ کو فیض نے اس طرح بیان کیا کہ

'ہم لاہور کی جانی پہچانی سڑکوں سے گزر رہے تھے لاہور ہمارا تماشا دیکھ رہا تھا پھر لوگوں نے ہمیں پہچان لیا بازار میں ہمارا تانگہ کھڑا تھا اور اس کے اردگرد یار ان وفا کا ہجوم اس میں نان بائیوں سے لے کر مشہور و معروف صحافی تک سبھی شامل تھے۔ بالکل جلوس کی سی شکل بن گئی میں نے زندگی میں ایسا دلکش جلوس نہیں دیکھا۔ اسی سے متاثر ہو کر میں نے یہ نظم لکھی۔'

آج بازار میں پابہ جولاں چلو
دست افشاں چلو مست ورقصاں چلو
خاک برسر چلو، خوں با داماں چلو
راہ تکتا ہے سب شہر جاناں چلو

اس چار سالہ دور اسیری میں فیض کی شاعری میں جذبہ حب الوطنی ابھر کے سامنے آیا گویا فیض کے دل کی صدا نے الفاظ کا روپ دھار لیا اور سرزمین وطن سے محبت کا اظہار فیض کی شاعری میں بخوبی ظاہر ہوا۔ دست صبا میں فیض نے جو الفاظ استعمال کیے وہ وطن کا حال زار بہت خوبصورتی سے ظاہر کرتے ہیں۔

نوائے مرغ کو کہتے ہیں اب زبان چمن
کھلے نہ پھول اسے انتظام کہتے ہیں
صبا سے کرتے ہیں غربت نصیب ذکر وطن
تو چشم صبح میں آنسو ابھرنے لگتے ہیں

اکتوبر ۱۹۵۸ء میں ایوب خاں نے مارشل لاء نافذ کر کے اقتدار حاصل کیا تو فیض اس وقت ماسکو میں ایک کانفرنس میں تھے۔ جلد ہی (۱۹۵۹ء میں) وہ لندن سے ہو کر لاہور پہنچے پھر وہی ہوا جو کہ ہونا تھا۔ اس بار پھر حکمران وقت نے فیض کو اپنے لیے خطرہ محسوس کیا اور حکومت فیض کو خطرہ کیوں نہ تصور کرتی، وہ محبّ وطن جو تھا۔ پاکستان میں ان کی آمد کے اگلے روز فیض کو ایک بار پھر قید و بند کی مشقت کے لیے مقدر کے رحم و کرم پر راضی ہونا پڑا۔ میجر محمد اسحاق کے

بقول فیض کے لیے وہ لمحے انتہائی سخت تھے جب انہیں شروع کے تین مہینے قید تنہائی میں رکھا گیا، ان دنوں فیض صاحب کو قلم، دوات، کاغذ سب چیزوں سے محروم رکھا گیا اور وہ جیل میں رہتے ہوئے کچھ بھی لکھ نہ سکتے تھے۔ سچ ہی کہتے ہیں آمریت کتنی ہی اچھی کیو ں نہ ہو وہ اچھی نہیں ہوتی کیونکہ وہ آمریت ہوتی ہے جب کہ بدترین جمہوریت پھر بھی بہتر ہوتی ہے۔ جب لوگوں کے بنیادی حقوق کو غصب کرتے ہوئے فوجی حکومت نے حق اظہار بھی ضبط کر لیا تو فیض کو کہنا پڑا۔

متاع لوح و قلم چھن گئی تو کیا غم ہے
کہ خونِ دل میں ڈبولی ہیں انگلیاں میں نے
زباں پر مہر لگی ہے تو کیا کہ رکھ دی ہے
ہر ایک حلقۂ زنجیر میں زباں میں نے

اس دور قید میں فیض نے جوشاعری کی وہ 'زنداں نامہ' اور 'دست صبا' کی زینت بنی۔ فیض جب جیل میں تھے تو ان کے ساتھی وہاں بھی مشاعرے کا اہتمام کر لیا کرتے۔ وہ تمام فوجی افسران جو فیض کے ساتھ مقید تھے، فیض کی حوصلہ افزائی ضرور کرتے تھے۔۔ ظفر اللہ پوشانی کے مطابق 'ہم سب جب مقدمے کی شُنوائی کے لئے عدالت جاتے تھے تو آتے جاتے ہوئے فیض کا جیل ہی میں لکھا ہوا یہ تماشہ گایا کرتے تھے ۔'

دربار وطن میں جب اک دن سب جانے والے جائیں گے
کچھ اپنی سزا کو پہنچیں گے، کچھ اپنی جزا لے جائیں گے
اے خاک نشینوں اُٹھ بیٹھو، وہ وقت قریب آ پہنچا ہے
جب تخت گرائے جائیں گے، جب تاج اُچھالے جائیں گے

پروفیسر آل احمد سرور نے ان کی قیدو بند کی نظموں کے بارے میں لکھا ہے۔ 'فیض کو آتش خانوں کی مقدس تپش ملی ہے مگر اس نے انہیں جھلایا نہیں بلکہ ان کی شخصیت کو قوت اور ان کی شاعری کو تب و تاب و دیت کی ہے۔'

صدر ایوب خان کی سخت پابندیوں کے خلاف فیض نے یہ نظم لکھی تھی۔

نثار میں تری گلیوں کے اے وطن کہ جہاں

چلی ہے رسم کہ کوئی نہ سر اٹھا کے چلے
جو کوئی چاہنے والا طواف کو نکلے
نظر چُرا کے چلے جسم و جاں بچا کے چلے

فیض کے اس کلام کو ملکہ ترنم نے گا کر ہمیشہ کے لیے امر کر دیااور پھر فیض نے جب ظلم و جبریت کی انتہا دیکھی تو ان سے رہا نہ گیا۔

بنے ہیں اہل ہوس مدعی بھی منصف بھی
کسے وکیل کریں کس سے منصفی چاہیں
مگر گزارنے والوں کے دن گزرتے ہیں
ترے فراق میں یوں صبح و شام کرتے ہیں

جب اپنے ہی ہم وطنوں کے ہاتھوں ذلت و رسوائی ملی تو قیدی کے درد تیز تر ہونے لگا، تب فیض یہ لکھ ہی گئے۔

بُجھا جو روزنِ زنداں تو دل یہ سمجھا ہے
کہ تیری مانگ ستاروں سے بھر گئی ہو گی
چمک اٹھے ہیں سلاسل تو ہم نے جانا ہے
کہ اب سحر ترے رُخ پر بکھر گئی ہو گی

یہ نہایت افسوس کی بات ہے کہ فیض جیسے محبّ وطن اور انتہائی دانشور سرمایہ فیض کی شکل میں فیلڈ مارشل صاحب سمیت کسی کو راس نہ آیا۔

روش روش ہے وہی انتظار کا موسم
نہیں ہے کوئی بھی موسم بہار کاموسم
گراں ہے دل پہ غم روزگار کا موسم
ہے آزمائش حسن نگار کاموسم

فیض کے ہر ہر شعر میں دردو الم ہے، تو تاریکی کے چھٹ جانے کی امید بھی ہے، فیض نے اپنی عمر کا حصہ جیل اور جلاوطن ہو کو ضرور گزارا مگر اس کے باوجود فیض کے نظریات آزاد رہے۔

فیض کے جسم و جان کو قید کر لیا گیا مگر ان کی روح آزاد رہی، فیض کے نظریات دن بدن مقبول ہوتے رہے، ان کے تن بدن پر تو پہرے دار بٹھا دیے گئے مگر ان کی سوچ پر کوئی لیڈر پہرے نہ لگا سکا اورکوئی ایسا کر ہی کیونکر سکتا تھا، فیض ذہنی طور پر مضبوط تھا اس کی سوچ مضبوط تھی اس کا جذبہ سچا تھا۔ فیض اپنے وقت کا سقراط ثابت ہوا وہی جذبہ، وہی آزاد خیالی، وہی الزامات جو سقراط پر مسلط کیے گئے یہ سب کچھ فیض کے ساتھ بھی تھا کہ وہ کمیونزم کی آڑ میں قوم کے جوانوں کو اکسا رہا ہے، پھر فیض کا صبر بھی سقراط کی طرح جو جیل میں قید رہ کے جابر حکمران کوان الفاظ میں للکارتا ہے۔

دربار وطن میں جب اک دن سب جانے والے جائیں گے
کچھ اپنی سزا کو پہنچیں گے، کچھ اپنی جزا لے جائیں گے
اے خاک نشینو اٹھ بیٹھو، وہ وقت قریب آ پہنچا ہے
جب تخت گرائے جائیں گے،جب تاج اچھالے جائیں گے
اب ٹوٹ گریں گی زنجیریں اب زندانوں کی خیر نہیں
جو دریا جھوم کے اٹھے ہیں،تنکوں سے نہ ٹالے جائیں گے

اور فیض نے مایوسی کو گناہ سمجھتے ہوئے دینا کو امید کا پیغام دیا انہوں نے اپنی امید کی کیفیت کو ان الفاظ میں ظاہر کیا۔

صبا نے پھردرِ زنداں پہ آکے دستک دی
سحر قریب ہے، دل سے کہو نہ گھبرائے

اور اسی للکار کے ساتھ قوم کو حوصلہ دینے کے لیے اس دن کاوعدہ بھی یاد کرادیا جب ظالموں کو اپنے مظالم کا حساب دینا ہوگا۔

ہم دیکھیں گے، ہم دیکھیں گے
لازم ہے کہ ہم بھی دیکھیں گے
وہ دن کہ جس کا وعدہ ہے
جو لوح ازل میں لکھا ہے

جیل سے آزاد ہوئے تو ماسکو چلے گئے جہاں انہیں لینن امن ایوارڈ سے نوازا گیا پھر وہ وقت بھی آیا کہ خود کو جلاوطن کرتے ہوئے پکار اٹھے۔

مرے دل، مرے مسافر
ہوا پھر سے حکم صادر
کہ وطن بدر ہوں ہم تم
دیں گلی گلی صدائیں
کریں رُخ نگر نگر کا
کہ سراغ کوئی پائیں
کسی یار نامہ بر کا
ہر اک اجنبی سے پوچھیں
جو پتہ تھا اپنے گھر کا
سر کُوئے نا شنا یاں
ہمیں دن سے رات کرنا
کبھی اُس سے بات کرنا
تمہیں کیا کہوں کہ کیا ہے
شبِ غم بری بلا ہے
ہمیں یہ بھی تھا غنیمت
جو کوئی شمار ہوتا
ہمیں کیا بُرا تھا مرنا
اگر ایک بار ہوتا

حالات نے فیض کو مجبور کر دیا کہ وہ وہ دیار غیر میں بھٹکتے پھریں۔ انہیں یقین تھا کہ وہ جب بھی اپنے وطن آئیں گے تو حکمرانوں کے پاس فیض کی گرفتاری کے سوا کوئی دوسرا راستہ نہ ہو گا۔ جلا وطنی کے دوران فیض نے کئی نظمیں لکھیں اور ان کی ہر نظم کا ہر شعر درد کی عکاسی کرتا ہے۔

اس حوالے سے غم نہ کر، شام، لہو کا سراغ، اور ہم تو مجبور تھے اس دل سے ،شہرت کے اعتبار سے آفاقی مقام رکھتی ہیں۔

درد تھم جائے گا غم نہ کر، غم نہ کر
یار لوٹ آئیں گے ،دل ٹھہر جائے گا، غم نہ کر، غم نہ کر
زخم بھر جائے گا
غم نہ کر، غم نہ کر
دن نکل آئے گا
غم نہ کر، غم نہ کر
ابر کھل جائے گی
رات ڈھل جائے گی
غم نہ کر، غم نہ کر
رُت بدل جائے گی
غم نہ کر، غم نہ کر

فیض صاحب ۱۹۶۴ میں آخر کار وطن لوٹے۔ ذوالفقار علی بھٹو ذہنی طور پر فیض کے قریب تھے اس کی وجہ یہ تھی کہ بھٹو صاحب بھی اشتراکیت سے متاثر تھے اور اپنی پارٹی کے منشور میں بھٹو نے اسلامی سوشلزم کا نعرہ لگایا تھا۔ بھٹو کے کہنے پر فیض نے وزارت تعلیم میں کلچرل ایڈوائزر کی نشست سنبھال لی۔ پھر وہ وقت آیا جب بحالی تعلقات کے مقصد سے بھٹو کے ساتھ ڈھاکہ گئے اور ناکام مذکرات کے بعد سخت مایوسی اور غم کا شکار ہوئے اور نظم 'ڈھاکہ سے واپسی پر' تحریر کی۔

ہم کہ ٹھہرے اجنبی اتنی ملاقاتوں کے بعد
پھر بنیں گے آشنا کتنی ملاقاتوں کے بعد
کب نظر آئے گے بے داغ سبزے کی بہار
خون کے دھبے دھلیں گے کتنی برساتوں کے بعد

۱۹۷۷ء میں ایک بار پھر فوجی انقلاب کے نتیجے میں فیض کو پہلے عہدہ اور پھر ملک چھوڑنا

پڑا۔ ۱۹۷۸ء سے۱۹۸۲ء تک چار سال خود ساختہ جلاوطنی میں بسر کیے۔ فیض نے تین سال بیروت میں گزارے، فلسطین کے مسلمانوں کا درد رکھنے کے سبب یاسر عرفات کے انتہائی معتمد رہے۔ سوویت یونین، لندن، بھارت، منگولیا، ویتنام، کینیڈا اور امریکہ میں بھی کچھ وقت گزارا۔ سوویت اور فیض کا گہرا تعلق رہا، لیاقت علی خاں نے سوویت کا دورہ نہ کیا مگر فیض کا کلام سوویت میں گونجتا رہا۔ دست صبا لکھی تو فوری طور پر ترجمہ ہوئی اور سوویت میں مقبول ہوئی۔ فیض او ر سوویت کی یک جہتی کو ظاہر کرنے کے لیے فیض کی ۵ نومبر۱۹۶۷ ء کو ماسکو میں لکھی جانے والی نظم 'اکتوبر۔۔۔ انقلاب روس کی سالگرہ' کا حوالہ ہی کافی ہے۔

اشفاق حسین کے بقول ' سجاد ظہیر کی یہ پیشن گوئی بڑی حد تک صحیح ثابت ہوئی۔ اس لیے کہ آج کسی کو بھی اس میں کوئی دلچسپی نہیں کہ راولپنڈی سازش کیس کی عدالت کے جج کون کون تھے اور کن کن لوگوں کو اس کیس میں قیدی بنایا گیا تھا لیکن فیض صاحب کی ہنستی مسکراتی شخصیت آج بھی لوگوں کے ذہنوں میں خصوصاً ان کے دلوں میں ضرور محفوظ ہے جن کا شعر و ادب سے ذرا سا بھی تعلق ہے۔'

۱۹۸۳ء میں فیض نے ہمیشہ کے لیے لاہور بسنے کا فیصلہ کیا مگر قدرت نے ان کے نصیب میں اب مزید عمر نہ رکھی تھی۔ ۱۹ نومبر۱۹۸۴ء کو لاہور میں خالق حقیقی سے جا ملے۔

حوالہ جات

۱۔ فیض شخصیت اور فن، اشفاق حسین، پاکستان اسٹڈی سنٹر، جامعہ کراچی
۲۔ فیض شناسی، اسد الزماں، مغربی بنگال اردو اکیڈمی کلکتہ، ۱۹۹۰
۳۔ فیض احمد فیض : شخصیت اور شاعری، اطہر نبی، سیمانت پرکاش دہلی، ۱۹۹۱
۴۔ فیض کی شاعری :ایک مطالعہ، ڈاکٹر نصرت چوہدری، نگارشات لاہور، ۱۹۸۷
۵۔ نسخہ ہائے وفا ،فیض احمد فیض، مکتبہ کاروان لاہور
۶۔ فیض احمد فیض تنقیدی جائزہ، مرتبہ، خلیق انجم۔